میر انیس کے آباء کی ادبی خدمات

پروفیسر ناصر علی رضا
اسسٹنٹ پروفیسر اردو
گورنمنٹ کامرس کالج، اقبال ٹاؤن، لاہور

LITERARY SERVICES OF FOREFATHERS OF MEER ANEES

Nasir Ali Raza
Assistant Professor of Urdu
Govt. College of Commerce, Iqbal Town, Lahore

Abstract

The matchless literary contributions of Meer Anees' family for Urdu literature are unforgettable. The three distinguished ancestors of Meer Anees will always be recognized in the literary history of Urdu. Meer Ghulam Hussain Zahak is the guiding star of light humour, limerick satire and elegy. Meer Hasan is counted among the first rank Urdu poets for his power of narration, depiction of emotions, reflection of scenes and simple but effective style. The elegy of Urdu poetry got its credibility, focus and prominence through Meer Mustahsan Khaleeq. The literary achievements of Meer Anees' forefathers have been recognized in all forms of poetry, however, masnavi and elegy will owe to their poetic works for long.

Keywords:

لکھنؤ، میر انیس، میر غلام حسین، مرثیہ نگاری، ادبی، خدمات، برصغیر، اردو، زبان و ادب

میر انیس کا خاندان اپنی علمی و ادبی خدمات کی بنا پر برصغیر پاک و ہند میں ایک منفرد مقام کا حامل ہے۔ اردو زبان و ادب میں کسی ایک خاندان کو سوائے میر انیس کے گھرانے کے یہ اعزاز حاصل نہیں کہ آٹھ پشتوں تک، اپنے اپنے عہد کے مسلم الثبوت استاد شعرا گزرے ہوں۔ اجداد میر انیس میں جس فرد کا سب سے پہلے نام لیا جاتا ہے وہ میر امامی موسوی ہیں، جن کی علمی و ادبی روایات کی حکایات موجود ہیں تاہم ان کے نمونہ کلام کا تاحال کوئی ثبوت میسر نہیں۔ ان کی مثنوی ''باغ مراد'' کا ذکر کیا جاتا ہے لیکن زمانے کی دست برد سے یہ محفوظ نہ رہ سکی۔ میر انیس کے پردادا میر غلام حسین ضاحکؔ پہلے فرد ہیں جن کے ادبی کارناموں کی روایت عام ادبی تواریخ اور تذکرہ نگاروں کے ہاں ملتی ہے۔ میر غلام حسین ضاحک اردو شعرا کے اس عظیم خاندان کے مورث اعلیٰ ہیں جس میں شعر و سخن کا قدرتی ملکہ سات پشتوں تک قائم رہا اور جن کی نسل میں دو عظیم شعرا ہوئے جنھوں نے دو شعری اصناف کو اس مقام تک پہنچا دیا کہ ان سے پہلے کوئی اس مرتبے پر فائز تھا اور نہ آج تک دو تین صدیاں بیت جانے کے بعد اس رتبے کو پاسکا۔ اردو صنف مثنوی میں میر حسن کی ''سحر البیان'' کا سحر آج بھی قائم ہے اور مرثیہ نگاری کے باب میں میر انیس کے بعد ''طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس'' کی صدا سنائی دیتی ہے۔

میر غلام حسین ضاحک نے اپنے عہد میں ایک ہجو گو شاعر کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کی۔ ضاحک کی تین پشتیں دلی میں گزریں لیکن اٹھارویں صدی کے وسط تک دلی کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور کئی اہلِ سخن دہلی کو خیر باد کہہ کے ریاست اودھ کا رخ کر رہے تھے جن میں سودا، ضاحک، میر تقی میر اور غلام ہمدانی مصحفی جیسے نامور شعرا شامل تھے۔ میر غلام حسین ضاحک کی ادبی شہرت میرزا رفیع سودا سے ہم عصرانہ چشمک کی صورت میں جڑی ہوئی ہے۔ میر ضاحک کا ادبی مقام متعین کرنے میں سب سے مستند ذریعہ ان کے فرزند میر حسن کا ''تذکرہ شعرائے اردو'' ہے۔ ان کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مولانا غلام حسین المتخلص بہ ضاحک ابن عزیز اللہ والد ایں فقیر مولف از سادات عالی شان سپہر مکاں، عالم و فاضل، ناثر و ناظم، بہ غایت فہیم، ہزل دوست، مزاح پسند، بذلہ گو و نکتہ سنج، درویش مزاج متوکل۔ از سی سال ترک روزگار غودہ، بہ کمال بے پر بہ سرمی برند۔ در فہمید علم موسیقی گوش شنواد در فکر رسا۔ باوجود آں علم بہ کار بردہ اند۔ چوں طبائع سامعاں را در خور سخن بلند نہ یافتند۔ بہ قدر حوصلہ آں ہاں بہ طرف ہزل توسن قلم راندند، لیکن زبان عجیب و غریب اختیار کردہ اند کہ از آدم تا ایں دم کسے نہ گفتند، چناں چہ از اں جملہ یک مطلع ترقیم می نماید مشتے نمونہ از خروارے:
>
> یا ایھا التلانگہ کرو جھلانگہ   کل توپچی پرابیہ فرد بکا سرہ''(۱)

میر ضاحک کے فارسی اور اردو، دونوں زبانوں میں اشعار موجود ہیں۔ ان کے دیوان سے متعلق

سبھی تذکرہ نگار خاموش ہیں یہاں تک کہ ان کے بیٹے میر حسن بھی ''تذکرہ شعرائے اردو'' میں چپ دکھائی دیتے ہیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب رسالہ ''معاصر'' پٹنہ مطبوعہ ۱۸ جولائی ۱۹۶۲ء کی وساطت سے ''اسلاف میر انیس'' میں دیوان ضاحک کی خبر دیتے ہیں جس میں ہزلیات اردو ۲۲۰، غزلیات فارسی ۵۹، رباعیات ۵۹، قصائد وسلام ۴۰ اور ۳ منقبت شامل ہیں۔ اردو تذکروں میں عمومی طور پر میر غلام حسین ضاحک کی پہچان ایک ہجوگو اور مزاح نگار کی حیثیت سے کروائی گئی، ممکن ہے اس عہد کے لحاظ سے تذکرہ نگاروں کے نزدیک کسی شاعر کے دیوان کی جستجو پیش نظر نہ ہو اور جو غالب رجحان سامنے آیا اسی کے لحاظ سے اسے متعارف کروا دیا گیا۔ ہجوگوئی کے ضمن میں مولوی ساجد کا نام لیا جاتا ہے کہ متذکرہ شخص معرکہ کربلا میں یزید کو حق بجانب سمجھتا تھا جس کے نتیجے میں وہ میر ضاحک کا ہدف طنز بنا۔ میر ضاحک کی بطور ہجوگو شہرت میرزا رفیع سودا سے ہم عصرانہ چشمک کی وجہ سے عام ہوئی۔ اردو ادب میں ہم چشموں کی رقابت صحت مند روایت کے طور پر موجود رہی۔ میر ضاحک اور میرزا رفیع سودا کے مابین بات ابتذال کی حد تک جا پہنچی تھی۔ تاہم میر ضاحک کی غزلیات اور قصائد وسلام کو نظر انداز کیا گیا۔ مزاحیہ کلام کے سوا ضاحک کی شاعری کا بغور تجزیہ کیا جائے تو بخوبی معلوم ہو جائے کہ میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' اور مراثی انیس کی شہرت دوام کے ابتدائی خدوخال کلام ضاحک سے بنیاد پاتے ہیں۔ غزل گوئی اردو شعرا کی سب سے محبوب صنف تھی۔ میر ضاحک کی غزلیات کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے مروجہ مضامین سے باخبر تھے۔ اگرچہ ان کی غزل میں وہ شان نہیں جو میر وسودا کے عہد زریں کا خاصہ تھی۔ باوجود اس کے میر ضاحک کی غزل ایسی نہ تھی جسے یک قلم نظر انداز کیا جائے۔ لسانی وادبی اعتبار سے یہ اس قابل ضرور تھی کہ مستقبل کی شاعری کا تانا بانا اس پہ استوار کیا جا سکے۔ ضاحک کی غزل کے چند درج ذیل اشعار سے یہ بات بخوبی عیاں ہوتی ہے:

زلف سنبل ہے چشم نرگس دیکھ — چہرہ گلفام کر گیا دلبر
ان گلوں بیچ گل کی باس نہیں — دل گلستان کر کے پچھتایا
ضاحکؔ عصر جانے عشق کی ریت — راہ سے راہ ایسے نکلے ہے

....

در پیش اگر روز اجل آہ نہ ہوتا — قصہ تھا محبت کا یہ کوتاہ نہ ہوتا
کیا دیجیے اصلاح خدائی کو ولیکن — کافی تھا ترا حسن اگر ماہ نہ ہوتا
اس آن تھنبے آنسو جس آن کہ جی ڈوبا — تب جان سے ہم اٹھے جب دیدۂ نم اٹھے

میر غلام حسین نے غزل گوئی اور ہزل پیمائی میں ضاحکؔ تخلص کا خوب استعمال کیا لیکن مرثیہ گوئی اور سوز وسلام میں انھوں نے اس تخلص کو مناسب نہ جانا۔ یہاں ان کا نام غلام حسین یا صرف غلام ملتا ہے۔

اگر میر انیس کے مصرع ''پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں'' کو دیکھا جائے، جو انیس نے اپنے بیٹے رئیس کی زبان سے کہلوایا تھا، تو میر غلام حسین ضاحک تک پانچویں پشت کا یہ سلسلہ درست ثابت ہوتا ہے۔ میر انیس کا یہ شعر اس بات کی بھی دلیل ہے کہ میر غلام حسین اپنے عہد کے ایک نامور مرثیہ گو بھی تھے۔ اردو مرثیے کے متعلق ہر دور میں ایک عجیب طرز بے اعتنائی اپنایا گیا۔ حالانکہ اردو تنقید کی خشت اول ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں الطاف حسین حالی نے صنف مرثیہ کو اردو کی سب سے موثر صنف قرار دیا۔ میر غلام حسین ضاحک کے ۱۹۶۱ء میں بازیافت ہونے والے دیوان میں کوئی باقاعدہ مرثیہ تو نہیں ملتا تاہم سلام، منقبت، قصائد اور نوحے کی اقسام پائی جاتی ہیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب نے ''اسلاف میر انیس'' میں میر ضاحک کے چند قصائد اور سوز و سلام کے نمونے درج کیے ہیں ان میں سے تین امثال حسب ذیل ہیں :

(قصیدہ در مدح امام حسینؑ)

حسین ولی عبد حیی قدیم ۔۔۔ رہا زندہ من بعد کردن دو نیم
بنوک سناں سورہ کہف خواند ۔۔۔ سناتا با صحاب کہف الرقیم
گل باغ حیدر کی سن کر خزاں ۔۔۔ چو منقار بلبل شدہ دل دو نیم
امام سوم کا سوم آج ہے ۔۔۔ (نوحہ) جہاں سب اسی غم سے تاراج ہے
سلام لیجیو اے شاہ کربلا میرا ۔۔۔ (سلام) سلام لیجیو اے شافع جزا میرا
یا حسین ابن علی محبوب باری السلام ۔۔۔ ختم ہے تجھ ذات پر طاعت گزاری السلام
کربلا کے قتیل تم پہ سلام ۔۔۔ راہ حق کے دلیل تم پہ سلام(۲)

خاندان میر انیس میں میر حسن وہ تخلیق کار ہیں جن کی زبان حقیقی معنوں میں دہلویت اور لکھنویت کا امتزاج ہے۔ چونکہ میر حسن نے اپنا بچپن دلی میں گزارا، جادۂ تصوف کے نامو شاعر خواجہ میر درد کی صحبت میں بحیثیت شاگرد کچھ عرصہ گزارا ہوا تھا اس لیے جوانی کی مشق سخن کے لکھنوی دور کے باوجود دہلوی زمانے کی کیفیات شاعری میں کسی نہ کسی صورت میں نظر آتی ہیں۔ میر حسن نے اپنے عہد کی تمام مروجہ اصناف شعری میں طبع آزمائی کی اور ہر صنف سخن میں نام کمایا۔ وہ ایک پرگو شاعر تھے۔ ان کے کلیات چھپنے کی کوئی مصدقہ روایت موجود نہیں۔ ان کی مثنویات اور غزلیات کے دیوان متعدد بار شائع ہوئے۔ تاہم صاحبان ذوق کے پاس میر حسن کے کلیات کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ سید ضمیر اختر نقوی کے کتب خانے میں کلیات میر حسن کے دو نایاب قلمی نسخے موجود ہیں۔ وہ اپنی کتاب ''خاندان میر انیس کے نامور شعرا'' میں کلیات میر حسن کی تفصیل بہم پہنچاتے ہیں۔ اس میں تقریباً پانچ سو غزلیں، گیارہ مثنویاں، سات قصیدے، ایک سو سینتالیس رباعیات، چودہ مخمس، ایک مسدس، ایک واسوخت، تین سو مثلث، بیالیس فردیات، مرثیے، سلام اور نوحے شامل ہیں۔

ایک قلمی نسخے میں میر حسن کا غیر مطبوعہ کلام خصوصاً سلام اور مرثیے کی صورت میں موجود ہے۔

متقدمین میں شعرا نے جس صنف سخن میں اپنے کمالات کے جوہر دکھائے، وہ غزل گوئی ہے۔ اردو تنقید اس روش پہ چل نکلی کہ اپنے تخلیق کاروں کو بہ لحاظ تخصیص باریک بینی کے ساتھ ٹکڑوں میں بانٹ کر دیکھا جائے۔ جس کے نتیجے میں سوؔدا کے بھاری بھر کم قصائد میں اچھی غزل، حالی کی مصلحانہ تنقید کے پیچھے ان کی خالص جمالیاتی شاعری اور اکبرالہ آبادی کی مزاحیہ تخلیقات کے نیچے ان کی سنجیدہ نگارشات دب کر رہ گئیں اور ان جیسے بیشتر لوگوں کی پہلو دار ادبی شخصیت کا کماحقہٗ اعتراف نہیں کیا گیا۔ اس زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھا جائے تو میر حسن کے ساتھ سب سے زیادہ بے انصافی ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ اردو کے سب سے بڑے مثنوی نگار کی بابت استفسار کیا جائے تو اردو ادب سے معمولی شناسائی رکھنے والا بھی فوراً میر حسن ہی کا نام لے گا لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ بہت عمدہ غزل گو بھی تھے۔ میر حسن کی غزل گوئی کو کس طرح نظر انداز کیا گیا، اس کے متعلق پروفیسر مظفر حنفی کا پر مغز تبصرہ ملاحظہ کیجیے:

> ''اگر بحیثیت مجموعی اردو کے پچیس اوسط قامت کے شعرا کی فہرست تیار کرنے کو کہا جائے تو اس میں قائؔم، انؔشا، ذوقؔ، امیؔر مینائی اور دوسرے بہت سے غزل گو تو شامل ہوں گے لیکن میر حسن کا دور دور تک نام و نشان نہ ہوگا۔ اگر میر حسن کی کم و بیش پانچ سو غزلیات پر ابتدا ہی سے خاطر خواہ توجہ صرف کی گئی ہوتی تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آج انھیں بھی اردو کے اہم شاعروں کی صف میں شمار کیا جاتا۔'' (۳)

میر حسن کی غزل صرف تعداد کے لحاظ سے اہمیت کی حامل نہیں، اس کا رنگ ڈھنگ وہی ہے جو اس زمانے میں میر تقی میر اور میرزا رفیع سودا غزل میں پیش کر رہے تھے۔ یہ بات اپنی جگہ وزن رکھتی ہے کہ مہ کامل کی روشنی میں ستاروں کی تابنا کی ماند پڑ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''سحرالبیان'' کی آفاقیت میں ان کی غزلیں اپنا رنگ نہ جما سکیں ورنہ ان کا لب و لہجہ بھی انھی خصوصیات کا مرقع ہے جو مثنوی میں موجود ہیں۔ میر حسن نے آج سے دو اڑھائی سو سال پہلے وہ زبان استعمال کی جس سے آج بھی کان شناسائی رکھتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انھوں نے ان الفاظ کا قطعاً استعمال نہ کیا جو آج متروک ہو چکے ہیں۔ میر حسن ایک متوارث شاعر تھے۔ ان کے بزرگوار دہلوی تہذیب کے آئینہ دار تھے۔ اگرچہ میر حسن نے تھوڑا عرصہ ہی دہلویت کا ذائقہ چکھا لیکن ان کی شاعری، بالخصوص غزل پہ اس کا رنگ غالب رہا۔ اگر نام استعمال کیے بغیر میر و سودا کی غزل اور میر حسن کی غزلیات کو دیکھا جائے تو ان میں امتیاز برتنا مشکل ہو جائے گا۔ میر حسن کی غزل میں فنی اعتبار سے وہی رنگ تغزل غالب نظر آتا ہے جو میر تقی میر کا طرۂ امتیاز تھا۔ اسی انداز میں صنائع بدائع کا استعمال کیا گیا۔ فن کے رموز کو مخصوص دہلوی لب و لہجے میں نبھایا گیا۔ فکری اعتبار سے بھی دہلویت سے انحراف

کم ہی نظر آتا ہے۔ البتہ ان کا عہد شباب ریاست اودھ میں گزرا، اس لیے میر حسن کی غزل میں خارجیت کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔ تخلیق کار اپنے عہد کے انفرادی واجتماعی حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میر حسن کا نوخیز زمانہ آوارہ وطنی میں گزرا، دہلی کی تباہی کا سناٹا ان کی غزل میں منقش رہا۔ سفر کی صعوبتیں، فیض آباد کے محلات میں کامیاب عشق کی داستان کی سرسراہٹ، ان کی غزل کا حصہ رہی۔ تاہم خلوص جذبات، صداقت کا اظہار اور سوز گداز جو دہلویت کا خاص رنگ ہے، میر حسن کی غزل زیادہ تر انھی صفات سے متصف نظر آتی ہے۔ ساتھ ساتھ مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں بندش کی چستی اور مضامین کی ندرت بھی کلام میر حسن میں بآسانی دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کی جملہ صفات شعری سے متصف چند غزل کے اشعار حسب ذیل ہیں:

کل کسی کا ذکر خیر آیا تھا مجلس میں حسنؔ
اس دل بے تاب پر ہم ہاتھ دھر کے رہ گئے

کبھی بستا تھا اک عالم یہاں بھی
یہ دل جو کہ اجڑا سا نگر ہے

ہم نہ نکہت ہیں نہ گل ہیں جو مہکتے جاویں
آگ کی طرح جدھر جاویں، دہکتے جاویں

ہم کرشمہ ابرو سے جس کے مرتے ہیں
اب اس نے کھینچی ہے تلوار، دیکھیے کیا ہو

مزے نہ دیکھے کبھی ہم نے زندگانی کے
یونہی گزر گئے افسوس دن جوانی کے

میں نے تو بھر نظر تجھے دیکھا نہیں ابھی
رکھیو نہ حساب میں ملاقات آج کی

میر حسن کی غزل کے متعلق عبدالباری آسی کی بڑی جامع رائے ہے:

''میر حسن کا انداز غزل گوئی متقدمین میں دردؔ، میرؔ سے زیادہ ملتا ہے۔ وہی سوز و گداز، وہی والہیت، وہی برجستگی اور جاذبیت جو قدرت نے ان دونوں کو ودیعت کی تھی، وہ میر حسن کو بھی دی گئی اور نہ جاننے والا میر اور درد کے کلام سے ان کے کلام کو علیحدہ نہیں کرسکتا۔''(۴)

اردو کلاسیکی ادب میں مثنوی نگاری اپنی خاص دلکشی کے باعث شعرا کی مرغوب صنف تھی۔ صف اول کے تمام شعرا نے صنف مثنوی میں طبع آزمائی کی لیکن جو مقام و مرتبہ میر حسن کا ٹھہرا، وہ نہ پہلے کسی کو میسر تھا اور نہ ہی عصر حاضر تک کسی کو مل سکا۔ میر حسن نے کئی مثنویاں لکھیں جن میں ''رموز العارفین''، ''گلزار ارم''، ''خوان نعمت''، ''مثنوی تہنیت'' اور بالخصوص ''سحر البیان'' شامل ہیں۔ ''رموز العارفین'' حضرت ابراہیم ادھم بادشاہ بلخ کے سلطنت کو خیر باد کہہ کے درویشی اختیار کرنے کی داستان ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سالکین کی حکایات کو تمثیلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ''گلزار ارم'' میر حسن کے زمانہ آوارہ وطنی کی بپتا ہے جس میں ''مکن پور کی چھڑیوں کا حال''، فیض آباد کی تعریف اور لکھنو کی مذمت کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ مثنوی ''سحر البیان'' جو مثنوی میر حسن یا مثنوی بدر منیر کے نام سے بھی پہچانی جاتی ہے، بلاشبہ اردو ادب کا لازوال خزینہ ہے۔ اس شاندار کارنامے کی بدولت میر حسن کو شعرائے اردو کی صنف اول میں جگہ دی جاتی ہے۔ بنظر غائر ''سحر البیان''

کا مطالعہ کیا جائے تو اس کی کہانی کوئی نرالی نہیں۔ مختلف حکایتوں کا مجموعہ ہے لیکن جس دلکش پیرائے میں اس کا مرقع کھینچا گیا ہے اس کی ابتدا بھی میر حسن سے ہوتی ہے اور انتہا بھی۔ اس میں انھوں نے اپنی قدرت زباندانی، قوت فکر، نادر تشبیہات واستعارات، سلاست بیان کا وہ جادو جگایا ہے کہ نہیں معلوم وہ کتنے دن اس کیفیت میں منہمک رہے ہوں گے تب جا کر ایسے موتی سے حروف برآمد ہوئے۔ اس سے ان کی محنت شاقہ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے:

زبس عمر کی اس کہانی میں صرف　　تب ایسے یہ نکلے ہیں موتی سے حرف
جوانی میں جب ہو گیا میں پیر　　تب ہوئے ہیں سخن بے نظیر
نہیں مثنوی ہے یہ اک پھلجھڑی　　مسلسل ہے موتی کی گویا لڑی
نئی طرز ہے اور نئی زباں　　نہیں مثنوی ہے یہ سحر البیاں

مثنوی ''سحر البیان'' میر حسن کا وہ طرہ امتیاز ہے کہ جب تک اردو زبان کا وجود ہے اس کی تابنا کی کبھی مدھم نہیں ہوگی۔ اس میں جس سطح پہ فکری وفنی لوازمات کو نبھایا گیا ہے، اس تک پہنچنے کے لیے صدیاں درکار ہیں۔ ممکن ہے آج فکری اعتبار سے ناقدین معترض ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میر حسن نے مختلف طبقات انسانی کی فطرت کو پیش کیا ہے، اس میں عالمگیریت کا عنصر شامل ہے۔ بلاشبہ آج عیش وطرب، غم والم کا ظاہری کینوس بدل گیا ہے لیکن اس کا رنگ ڈھنگ وہی ہے جس کی تصویر کشی میر حسن نے کی تھی۔ فنی اعتبار سے بھی شاعری میں کئی تغیر وتبدل رونما ہوئے اور آج تنقید نگاری کے جدید معیارات پہ جانچتے ہوئے اس میں چند خامیاں بھی ہو سکتی ہیں لیکن محاسن کے انبار میں دو چار غلطیاں قابل اعتنا نہیں۔ مثنوی ''سحر البیان'' سے متعلق وہ جامع تبصرہ جو میر شیر علی افسوس نے اس کے دیباچے میں کیا تھا، اس کی دیرپا حیثیت آج بھی قائم ہے:

> ''مثنوی سحر البیان اسم با مسمیٰ ہے کیونکہ اس کا ہر شعر اہل مذاق کے دلوں کو لبھانے کو موہنی منتر ہے اور ہر داستان سحر سامری کا ایک دفتر، جو چیز کہ حقیقت میں خوب ہوتی ہے وہی طبائع کو مقبول ومرغوب ہوتی ہے۔ راست ہے کہ اس کا انداز سراپا اعجاز ہے اور وہ ہر صاحب طبیعت کے دمساز، تعریف اس کی جہاں تک کیجیے بجا ہے کیوں کہ فصاحت وبلاغت کا ایک دریا بہا ہے۔ احیاناً اگر کسی شعر میں غلطی یا اس کی بندش میں سستی پائی جائے تو قابل نام دھرنے کے اور اعتراض کرنے کے نہیں۔ اس لیے کہ جہاں ہنر کی کثرت ہوتی ہے وہاں عیب بہ قلت شمار میں نہیں ہوتا اور تعرض اس کا منصف مزاجوں کو نہیں بھاتا۔'' (۵)

میر حسن نے ''تذکرہ شعرائے اردو'' میں اپنی مرثیہ نگاری کی خبر دی۔ میر شیر علی افسوس بھی دیباچہ مثنوی ''سحر البیان'' میں میر حسن کی مرثیہ نگاری کی تائید کرتے ہیں۔ ان کے رثائی ادب سے متعلق تمام اہل قلم

مسعود حسن رضوی ادیب کی ''اسلاف میر انیس'' کے خوشہ چیں نظر آتے ہیں۔البتہ سید ضمیر اختر نقوی کی کتاب ''خاندان میر انیس کے نامور شعرا'' میں ایک غیر مطبوعہ قلمی نسخہ (نسخہ زاہد سہارنپوری) کی وساطت سے میر حسن کے دو سلام اور دو مرثیوں کا اضافی حوالہ دیتے ہیں۔میر حسن کے رثائی ادب کا نمونہ کچھ اس طرح کا ہے:

جب سکینہ نے سنا گھر میں کہ وہ سرور گیا یعنی جنت کو پیاسا سبط پیغمبر گیا
سنتے ہی یہ ماجرا ہوش تو یکسر ہو گیا رو رو کے بولی اماں بابا میرا کیدھر گیا

....

خواہر شبیر نے جب یہ فغاں فریاد کی آہ بھر اور سوز دل لخت جگر سے اٹھی
گھر میں اس ظالم کی جورو نے بھی تب یہ غل سنی گھر میں پوچھا لونڈیوں سے یہ کیسی غل مچی
تب کہا ان لونڈیوں نے کیا کریں اظہار ہم اہلبیت مصطفیٰ روتے ہیں اونٹوں پر بہم

میر وسودا کا عہد زریں تمام اصناف سخن کے لیے حیات آفریں ثابت ہوا۔غزل،قصیدہ اور مثنوی کے ساتھ ساتھ صنف رباعی میں بھی وسعتیں پیدا ہوئیں۔میر حسن کے ہاں بھی روایتی عاشقانہ اور صوفیانہ موضوعات پر رباعیات کی خوبصورت مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ان کی رباعیوں کی صرف دو امثال پہ نگاہ ڈالیے تو واضح ہو جائے گا کہ وہ صنف رباعی میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھے:

آباد ہوئے تو کیا ہوا دنیا میں ناشاد رہے تو کیا ہوا دنیا میں
وارستہ ہوئے نہ قید ہستی سے حسن آزاد ہوئے تو کیا ہوا دنیا میں

....

فرقت کے دنوں کو جو کوئی بھرتا ہو گا جوں شمع وہ شام و صبح کرتا ہو گا
جس پہ گزرتی ہو گی یہ ہجر کی رات کیا خاک وہ جیتا ہو گا مرتا ہو گا

اردو ادبی تاریخ گوئی کے ابتدائی نمونے تذکرہ نگاری کی صورت میں ملتے ہیں۔میر حسن سے پہلے میؔر، گردیزؔی اور قائؔم کے تذکروں کو شہرت مل چکی تھی، لیکن ان کے تذکرے کی شان منفرد ہے۔انھوں نے تذکرے کو تاریخ سے قریب کرنے کی سعی کی ہے اور شاعروں کا ذکر بالحاظ عہد کیا۔متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے خانوں میں شعرا کو تقسیم کر کے اپنی وسعت عملی اور ذوق تاریخ نگاری کا ثبوت دیا ہے۔اس تذکرے کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں ان شاعروں کا بھی ذکر ہوا ہے جو دہلی اور لکھنو کے علمی مراکز سے بہت دور بہار اور بنگال میں موجود تھے۔اس میں قریباً تین سو کے قریب شعرا کا ذکر ہے کہیں کہیں بہت ہلکی سی تنقید بھی ہے مگر زیادہ تر اپنے تمام معاصرین کو نہایت فراخدلی سے داد سخن دی ہے اور تھوڑا تھوڑا سا انتخاب کلام بھی دے دیا۔اردو ادب کی کوئی بھی تاریخ چاہے اس کا تعلق کسی بھی خطے سے ہو ''تذکرہ شعرائے اردو'' کے

بغیر ادھوری ہے۔ الغرض میر حسن نے اپنے عہد کی تمام رائج اصناف شعری میں طبع آزمائی کی اور اردو کے صف اول کے شعرا میں جگہ پائی۔

''بگڑا شاعر مرثیہ گو ہوتا ہے''، اردو شاعری میں اس روایت کا چلن عام تھا کہ ایسے میں ریاست اودھ میں چار ایسے تخلیق کار ابھرتے ہیں جنھوں نے اس مروجہ اصطلاح کو غلط ثابت کیا اور یہ باور کرایا کہ صنف مرثیہ بھی شاعری کی آبرو ہے۔ ان میں میر ضمیر، میر خلیق، میاں دلگیر اور مرزا فصیح شامل تھے۔ ان میں میر خلیق کو تخلیقی جواہر کے سوا یہ فضیلت ہے کہ وہ اردو کے سب سے بڑے مثنوی نگار میر حسن کے فرزند ارجمند تھے۔ میر مستحسن خلیق اردو زبان میں ایک مسلم الثبوت استاد شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ مشق سخن کی ابتدا والد گرامی کے تلمذ سے کی۔ ازاں بعد والد نے مصروفیات زندگی کے باعث اپنے عزیز دوست غلام ہمدانی مصحفی کی شاگردی میں بھیج دیا۔ خلیق کی شاعری کا نکتہ آغاز فیض آباد ہے۔ میر خلیق ابتدا ہی سے غزل کے روایتی مضامین میں یکتا تھے۔ فیض آباد میں مرزا تقی ترقی، جن کی سرکار سے موصوف وابستہ تھے، انھوں نے چاہا کہ فیض آباد میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا جائے، جس میں فیض آباد سے باہر دوسرے شہروں خصوصاً لکھنو سے شعرا کو مدعو کیا جائے۔ چنانچہ خواجہ حیدر علی آتش مشاعرے میں شرکت کی غرض سے فیض آباد پہنچے تو وہاں میر خلیق کی غزل سن کر اپنی غزل پھاڑ دی جس کی گونج آب حیات میں سنائی دیتی ہے:

> ''انہی دنوں مرزا تقی ترقی نے چاہا کہ فیض آباد میں شعروسخن کا چرچا ہو۔ مشاعرہ قائم ہو اور خواجہ حیدر علی آتش کو لکھنو سے بلایا۔ تجویز یہ تھی کہ انھیں وہیں رکھیں۔ پہلے ہی جلسے میں جو میر خلیق نے غزل پڑھی اس کا مطلع تھا:
>
> رشک آئینہ ہے اس رشک قمر کا پہلو　　صاف ادھر سے نظر آتا ہے ادھر کا پہلو
>
> ''آتش نے اپنی غزل پھاڑ دی اور کہا کہ جب ایسا شخص یہاں موجود ہے تو میری کیا ضرورت ہے۔''(۲)

میر انیس کے آبا میں میر خلیق کی شستہ و رفتہ زبان کے سبھی قائل تھے۔ یہاں تک کہ گیسوئے اردو زبان کو سلجھانے والے استاد شاعر امام بخش ناسخ بھی اپنے شاگردوں کو مشورہ دیا کرتے تھے کہ اگر زبان سیکھنی ہے تو خلیق کے گھرانے سے سیکھو۔ ''آب حیات'' میں عہد خلیق کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ اس دور میں غزلیں بکا کرتی تھیں اور خلیق بھی اس روایت میں شامل تھے، جس سے ان کی استادانہ حیثیت واضح ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں محمد حسین آزاد نے ایک واقعہ رقم کیا ہے جس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ میر خلیق غزل گوئی کے باب میں ایک صاحب اسلوب شاعر تھے کہ ان کے کلام سن کر ہی لوگ ان کے رنگ سخن کو پہچان لیتے تھے:

> ''ایک دن ایک خریدار آیا، اپنا تخلص ڈلوا کر شیخ ناسخ کے پاس پہنچا کہ اصلاح دے دیجیے۔

شیخ صاحب نے غزل کو پڑھ کر اس کی طرف دیکھا اور بگڑ کر کہا: اب! تیرا منہ ہے جو یہ غزل کہے گا؟ ہم زبان پہچانتے ہیں۔ یہ وہی پیر بخار اوالا ہے۔'' (۷)

میر انیس گاہے گاہے اپنی مجالس میں چند الفاظ و تراکیب روایتی انداز سے ہٹ کر بیان کرتے، جب سامعین کے چہروں پہ اجنبیت کے آثار دیکھتے تو وضاحت کرتے کہ یہ میرے گھر کی زبان ہے، حضرات لکھنو اس طرح نہیں کہتے۔ اکثر ناقدین نے اس بات کا تعلق اجداد میر انیس کی دہلویت سے جوڑا ہے کہ دراصل ایسی دلکش زبان دہلوی دبستان اور لکھنوی دبستان کے امتزاج کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ لیکن بہت کم لوگ اس کے حقیقی پس منظر سے واقف ہیں۔ اس کے متعلق امیر احمد علوی آگاہ کرتے ہیں جس سے میر انیس کے آباؤ اجداد، خصوصی طور پر میر خلیق کی لسانی خدمات کا بھی اندازہ ہوتا ہے:

''فیض آباد میں ایک ادبی دفتر محاورات و اصطلاحات و ضرب الامثال اردو کی تدوین کا قائم ہوا تھا۔ میر حسن مرحوم اس دفتر کے میر منشی رہے تھے۔ اب یہ خدمت میر خلیق کے سپرد ہوئی۔ جب کوئی جدید محاورہ محلات سے ترش کر نکلتا دفتر میں قلمبند ہوتا۔ جس گھرانے میں اس کی تحقیق و تنقید ہوتی تھی اسی میں اس مولود مسعود (انیس) نے آنکھیں کھولیں۔ خورشید کمال اپنے انتہائی عروج کے وقت بھی اس نعمت خداوندی پر فخر کرتا اور جب اس کی محاورہ بندی یا روزمرہ پر کوئی معترض ہوتا تو وہ فرماتے تھے کہ ''یہ میرے گھر کی زبان ہے حضرات لکھنو یوں نہیں بولتے۔'' (۸)

خلیق کی غزل اپنے معاشرے کی آئینہ دار تھی۔ چونکہ لکھنوی دبستان میں خارجیت کا پہلو غالب تھا لہٰذا میر خلیق کی غزل بھی انھی خصوصیات کی حامل تھی۔ ان کی غزل میں مضمون آفرینی موجود ہے اور زبان کو بھی اس کے مطابق لانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کہیں کہیں پڑھ کر ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ایک آنچ کی کسر باقی رہ گئی ہے۔ خلیق ویسی ہی غزلیں کہہ رہے تھے جیسی سارے معاشرے میں کہی جا رہی تھیں لہٰذا میر خلیق کی غزل گوئی میں روایت کی تکرار نظر آتی ہے۔ تاہم زبان کی دلکشی اپنا جادو جگاتی دکھائی دیتی ہے:

اشک جو چشم خوں فشاں سے گرا ۔۔۔ تھا ستارا کہ آسماں سے گرا
آتش گل پہ جل کباب ہوا ۔۔۔ رات بلبل جو آشیاں سے گرا
گویا زبان شمع جو ہوتی تو پوچھتا ۔۔۔ کٹتی ہے ہجر یار میں کیونکر تمام رات
دن کے جو ضبط گریہ سے رکتا ہے دم مرا ۔۔۔ روتا ہوں جا کے شہر سے باہر تمام رات

میر خلیق کی غزل گوئی کے باب میں اس طرح سکہ نہ جم سکا جس طرح آتش و ناسخ نے ناموری حاصل کی۔ فطری لگاؤ اور سادات گھرانے کی اجدادی خصوصیات کے پیش نظر اسپ قلم کا رخ مرثیہ گوئی کی

طرف موڑ دیا اور غزل کہنی ترک کر دی۔ اس لیے کہ مرثیہ گوئی میر خلیق کے نزدیک حصول ثواب کا ذریعہ بھی ہے اور عزت و ناموری کی راہ بھی۔ میر خلیق کی مرثیہ گوئی کو تمام تذکرہ نگاروں نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ فن مرثیہ کے ایک نامور استاد تھے۔ کلیات میر خلیق کہیں یکجا نہیں۔ تاہم ان کی مرثیہ نگاری کے حوالے سے اکبر حیدری کاشمیری نے یہ کارنمایاں سرانجام دیا کہ ان کے مرثیوں کو یکجا کر کے ''مراثی میر خلیق'' کے عنوان سے شائع کروا دیا۔ میر خلیق کی مرثیہ گوئی رباعی، سلام اور مسدس کی صورت میں ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ڈھائی سو کے قریب مرثیے، فن مرثیہ گوئی میں مہارت کا ثبوت ہیں۔

میر خلیق کے مرثیوں میں صورت حال کا بیان دردانگیز ہوتا تھا۔ ان کے مرثیوں کی تمہیدیں اور سامان سخن پردازی بہت بڑھا ہوا تھا۔ میر خلیق کی مرثیہ گوئی میں ادائے کلام کی خوبی نمایاں تھی۔ مجالس میں عمومی طور پر ابتدا سے اب تک یہ چلن عام ہو گیا ہے کہ مرثیہ نگار اپنی حرکات وسکنات سے غم انگیزی کو موثر بنانے میں مصروف رہتے ہیں لیکن میر خلیق اپنے کلام کو فکر کی گہرائی یا زیادہ سے زیادہ آنکھوں کی جنبش سے پرتاثیر بناتے تھے۔ خلیق مجلس سیدالشہداء میں رلانے کے لیے مرثیہ گوئی کرتے۔ ان کے نزدیک فن کی باریکیاں دکھانا اصل مقصد نہ تھا بلکہ مبکی اثرات پیدا کرنا بنیادی مطمح نظر تھا۔ لسانی اعتبار سے میر خلیق اپنے گھر کی زبان کے زیادہ قائل تھے۔ چونکہ اس میں اثر آفرینی بدرجہ اتم موجود تھی اس لیے وہ یہ زبان استعمال کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب امام بخش ناسخ زبان کو نکھارنے میں لگے ہوئے تھے اور کئی قدیم الفاظ زبان سے خارج کر کے نئے دل پذیر الفاظ کو رواج دے رہے تھے۔ میر خلیق کے مرثیوں میں کئی ایسے الفاظ موجود ہیں جو اب متروک ہو چکے ہیں لیکن ان کے گھرانے کی ثقہ زبان کی بدولت اس کی تاثیر میں کمی واقع نہ ہوئی۔ میر خلیق کے رثائی ادب کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں:

سلام کر کے جو شبیر کو چلا عباس — حرم پکارے ارادہ یہ کیا کیا عباس
میدان میں جب تیر سے مارے گئے اصغر — تا دیر اس کو پکارے گئے اصغر
کیا سلام پڑھا تو نے پر احوال خلیق — کون سی بیت تھی دل سب کا جو تڑپا نہ گئی
بانو نے سنا رن کی طرف جاتے ہیں اکبر …… اور مجھ سے بھی رخصت کے لئے آتے ہیں اکبر
روتے ہیں جو سرور انھیں سمجھاتے ہیں اکبر — بابا کو سفارش کے لیے لاتے ہیں اکبر

کہنے لگی بانو کہ یہ ارمان نکل جائے
اللہ کرے تن سے مری جان نکل جائے

میر انیس کے آبا کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ میر انیس کے اجداد میں تین ایسے ثقہ استاد شعرا ہیں جن کی فکری وفنی عظمت کا اعتراف عہد حاضر تک کیا جاتا ہے۔ میر غلام حسین ضاحک بذلہ سنج، ہجوگو اور مرثیہ نگار

کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ اردو شاعری کی تمام اصناف غزل، رباعی، مسدس، مرثیہ نویسی اور بالخصوص اردو مثنوی نگاری کے باب میں میر حسن کا شمار صف اول کے شعرا میں ہوتا ہے ''سحر البیان'' میں واقعہ نگاری، جذبات کی عکاسی، مناظر فطرت کی مرقع کشی کو جس سادہ و دلکش انداز میں میر حسن نے پیش کیا ہے اس کی مسلمہ حیثیت آج بھی قائم ہے۔ اردو مرثیہ کی طرف اہل نقد کی بے اعتنائی کو میر خلیق کی مرثیہ نگاری نے اعتبار بخشا۔ آبا میر انیس کے ادبی کارنامے تمام شعری اصناف میں مسلم ہیں تاہم مثنوی اور رثائی ادب ان کی خدمات سے سبکبار نہیں ہوسکتا۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) میر حسن، ''تذکرہ شعرائے اردو'' (قلمی)، مشمولہ ''اسلاف میر انیس''، مصنف سید مسعود حسن رضوی ادیب، نظامی پریس، لکھنو، ۱۹۷۰ء، ص:۹

(۲) ضاحکؔ، غلام حسین، مشمولہ ''اسلاف میر انیس'' محولہ بالا ص:۴۵ تا ۴۹

(۳) مظفر حنفی، پروفیسر، (مرتب) ''انتخاب کلام میر حسن''، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۱ ص:۹

(۴) آسی، عبدالباری، مقدمہ ''مثنوی میر حسن'' نول کشور پریس، لکھنو، ۱۹۴۱ء ص:۴

(۵) افسوس، میر شیر علی، (دیباچہ مثنوی سحر البیان) مشمولہ ''مثنوی میر حسن'' محولہ بالا، ص:۱۴

(۶) آزاد، محمد حسین، ''آب حیات'' اتر پردیش اکادمی، لکھنو، ۲۰۰۳ (چھٹا ایڈیشن) ص:۳۶۴

(۷) ایضاً، محولہ بالا، ص:۳۶۵

(۸) امیر احمد علوی، ''یادگار انیس'' سرفراز قومی پریس، لکھنو، ۱۹۶۰ء، ص۷۰، ۷۱